محمد صبغتہ اللہ

عبدل دہلوی کا ابراہیم نامہ

ریاست کرناٹک کو سارے بھارت میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اردو زبان و ادب کو عوامی سطح سے اٹھا کر بلند و بالا مرتبے پر پہنچایا۔ دکن کے سلاطین نے اسے اپنے درباروں میں جگہ دی۔ اس زبان کو سرکاری اور ادبی زبان بنایا، اپنی سرپرستی سے نوازا۔ اس کی مثالیں گولکنڈہ اور بیجاپور کے دور میں ملتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں ادبی مراکز بن کر ابھرے۔ یہاں کے سلاطین وقت کے علاوہ بے شمار ادبا و شعرا و صوفیا نے دکنی ادب کے سرمایے میں اضافہ کیا۔ گولکنڈہ میں وجہی نے قطب مشتری (مثنوی) اور سب رس (نثر) تصنیف کر کے دکنی ادب کے پہلے ادبی نقوش چھوڑے، بیجاپور میں اسی دور میں عبدل نے اپنے دور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو مصنف 'کتاب نورس' کی مدح میں قصیدہ 'ابراہیم نامہ' تصنیف کیا، جو بیجاپور کی پہلی ادبی تصنیف تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عبدل کو اس زبان میں شاعری کرنے میں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ دہلی کا رہنے والا تھا، دوسرے یہ کہ اس کے سامنے اس زبان کے فن پارے کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ دکنی ادب کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال کی تصنیف اور شہرت نے بیجاپور کے اسلوب کو بہت بعد کو بدلا ،لیکن اس سے قبل بیجاپوری اسلوب کو قائم کرنے میں عبدل کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کا مرتبِ ابراہیم نامہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے بڑی تحقیق و جستجو سے مقدمے میں ذکر کیا ہے۔ ایک نئی زبان میں شاعر کو جس کی اپنی مادری زبان نہیں ہے شاعری کرنے اور اس کو ایک ادبی کارنامے کے طور پر پیش کرنے میں کیا دقت پیش آئی ہوگی، اہل نظر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف قصیدہ گوئی سے کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ہی لفاظی اور مبالغہ آمیزی ہی کام آ سکتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ وقت نہ صرف بادشاہ ہے بلکہ اپنے وقت کا ماہر موسیقی و شاعر بھی ہے۔ اور اس کی تعریف کر کے اس سے داد حاصل کرنا بے شک عبدل کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے باوجود عبدل نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور بہت کامیاب طریقے سے نہ صرف اپنے ممدوح کی مدح کی بلکہ اس زمانے کے بیجاپور اور اس کی طرز معاشرت کی صحیح تصویر، دستاویز کی حیثیت سے قلم بند کر دی۔ اگرچہ آج بیجاپور میں اس دور کی بیشتر چیزیں کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں اور ہر ناظر کو دعوت نظارہ دینے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ اس دور میں اس شہر کی شان و شوکت اور عظمت کیا تھی اور ان کے مکین کس طرح کی بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے۔ آج ہم اکیسویں صدی میں ان کھنڈرات کی شان و شوکت اور عظمت سے مرعوب نظر آتے ہیں تو اس دور میں عبدل نے جو ان ساری چیزوں کو اپنے عروج کے وقت دیکھا اور اسے اپنے شاعرانہ شعور، نادر تشبیہات اور تلمیحات کے ساتھ بیان کیا ہے اس دور کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، اور اصلی تاریخ بیجاپور بھی۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس مثنوی کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور بہت تحقیق کے بعد اس کی تدوین و ترتیب میں جو محققانہ قدم اٹھایا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ آپ محقق بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی۔ لسانیات کی مدد سے قدیم الفاظ کی صحیح قراۃ کے بعد اس کے صحیح نتائج برآمد کیے ہیں جس کا ثبوت ان کا طویل مقدمہ ہے۔ اس کی مثال عبدل کے لفظ کی تحقیق ہے۔ مثلاً دیگر محققوں نے عبدالکیتی کے لفظ سے اس کے نام کا قیاس عبدالغنی کیا آپ نے اس لفظ کو غلط ثابت کیا اور بتایا کہ اس کو الگ کر کے پڑھنے سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا جو آپ کہہ رہے ہیں:

تو عبدل کیتی صفت شہ کر بیاں   رہے ہو بھر کر زمیں آسماں

(اے عبدل! تو شاہ کی صفت کتنی ہی بیان کیوں نہ کرے وہ تو سارے آسمان اور زمین میں بھر رہی ہے)

اس شعر کے پس منظر میں آپ نے اس کا نام عبدل اخذ کیا ہے۔ جو منطقی طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر اس کی شخصیت کے چند پہلو بھی اجاگر کیے ہیں، اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ عبدل یا عبداللہ علوم متداولہ اور فن شعر و موسیقی کے کامل معلومات رکھتا تھا۔ وہ بیجاپور کی عظمت، اس کی شان و شوکت کا احساس رکھتا تھا اور دیگر شعرا کی طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی سرپرستی اور استادی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

جن شاعروں کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوتی وہ اپنی تصنیف میں بادشاہ وقت کی تعریف و توصیف میں ایک باب ہی اس کے لیے وقف کیا کرتے اور یہ خصوصیت قدیم مثنویوں میں ملتی ہے۔ ابراہیم نامہ چونکہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا قصیدہ ہے مثنوی کی شکل میں ہے۔ اس صنف سخن میں شاعر کو یہ موقع فراہم ہوتا ہے کہ وہ بزمیہ یا رزمیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتا ہے۔ عبدل نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے ممدوح کی قلمی تصویر ایسی کھینچی کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مصوروں نے بھی رنگ و روغن کے ساتھ اس کی تصویریں بنائی ہیں جو عبدل کی قلمی تصویر سے بہت قریب ہے۔

صرف عبدل کے شاعرانہ بیان کو ہی سامنے رکھا جائے تو واقعی اس کے بیان میں مبالغہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے ہم عصروں نے اپنی تخلیقات میں ابراہیم عادل شاہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ عبدل کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں اور عبدل کی بات کا یقین ہوتا ہے۔

سنہ تصنیف :

بچن پھول گوند یوں ابراہیم نام کیا سیس پر برس بارہ تمام

سنہ 1012 مطابق 22 ربیع الاول 1020ھ پہ ختم ہوتا ہے۔ 24 مئی سنہ 1612 مطابق 3 ربیع الثانی سنہ 1021ھ (مرتب مثنوی ص 53-52 فٹ نوٹ)۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف جگت گرو (988۔ 1037ھ مطابق 1580۔ 1627) جسے عبدل شہ ابراہیم، شاہ استاد، شاہ نورس، شاہ عالم، عالم پناہ، شہ دکن اور جگت گرو کے نام اور القاب سے یاد کرتا ہے چھ سال کی عمر میں چچا کے انتقال پر 1580 میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تربیت احمد نگر کی شہزادی، علی عادل شاہ کی بیوی چاند بی بی کے زیر نگرانی ہوئی۔ ابتدائی دس گیارہ سال اس کو بڑی کٹھنائیوں میں گزارنے پڑے۔ دلاور خاں کے زوال کے بعد ابراہیم کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور آئی تو اس نے سلطنت کو استحکام بخشا پھر اس نے ساری توجہ علوم وفنون کی ترقی کی طرف مبذول کر دی۔ اور بیجاپور کو ودیا پور بنایا۔ اور یہاں فنون لطیفہ کے ماہروں کو جمع کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند کے گرد روشن ستارے جمع ہو چکے ہیں۔ اب ذرا عبدل کی زبان میں ابراہیم کا حلیہ دیکھیے :

یوں شہ روپ کی سن کہانی تمام نہ رہ کر سکیا مصر یوسف تمام
کہ مجھ روپ تھے ہو ادھک شہ دکھن کلا روپ بھر کر سو چوسٹھ لکھن
بھولی مجھ حسن ایک زلیخا مدام سو شہ دیکھ کر بھول عالم تمام

کندن شاہ کا رنگ ہو ذات بھر
ہر ایک ٹھاؤں پر رتن مل جوت دھر (360)
لگے پاچ شہ خط زیبا سہائے
جگیں لال رخسارے مانک دو آئے (361)
سہیں آنکھ دیدے سفیدی ملائے
جڑت جوت موتی میں لیلم نمائے (362)
دسے ناک دیدور سوتر درمیاں
رہے مکھ او پر خوئے ہیروں کی کھان (363)
کہیں لال مہندی نکھو پر دھرے

دسے جیوں سو گومید مانک جڑے (365)

کتاب نورس کا گیت نمبر 56 بھی اسی کی عکاسی کرتا ہے۔

در مقام کیدارا نورس

انترا

ایک کر دنڈی وادن دوجے پانڑی پستک پیکھت نورس گاوت اپتی
کیسر وستر دسن سیام نکھ للائی مہری گئی پرتی

(ایک ہاتھ میں سام ہے دوسرے ہاتھ میں کتاب جس کو وہ دیکھتا ہے اور نورس کے گیت گاتا جاتا ہے۔ اس کا لباس زعفرانی ہے، دانت کالے اور ناخن پر مہندی لگی ہے، بڑا ہنر مند اور محبت کرنے والا ہے۔ (نورس، ص۔ 131-132 مرتبہ نذیر احمد)

ابراہیم عادل شاہ خود ایک تخلیقی فنکار تھا اسی لیے اہل ہنر کی تربیت کرنا اولین فرض سمجھتا تھا اس کی سب سے بڑی خصوصیت کے بارے میں عبدل کہتا ہے۔

جکو آو جس کاج نس داد دے مرم بات کا پونچھ دل ہاتھ لے

اہل ہنر کا وہ استاد تھا اور وہ اس کے شاگرد۔ اہل فن کا قدردان اور اہل فن اس کے پرستار، مجلسوں میں شریک ہوتا اور اپنی فنکارانہ بصیرت سے رہبری کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

عبدل کے ابراہیم نامہ کے شعر نمبر 583 اور کتاب نورس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دکھنی میں بھی شاعری کرتا تھا۔ ایک اور تصنیف بدھ پرکاس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

بیجاپور اور اس کا حصار :

بیجاپور یا بدیا پور نگر عادل شاہی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ 1566 میں علی عادل شاہ اول (1552-1582) نے اپنے دور میں محل اور شہر دونوں کے لیے پتھروں کے مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔ نئی ریاستوں کی تاسیس کے دوران قدرتی دفاع کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ لیکن شہر بیجاپور کے لیے ایسے کوئی قدرتی وسائل نہیں تھے، اطراف و اکناف میں نہ کوئی پہاڑ یا ندی تھی۔ عادل شاہی سلاطین کا یہ مرکز خالص میدانی علاقے میں واقع تھا۔ راجدھانی یا پایہ تخت کی حفاظت کے لیے دفاعی اہمیت کے پیش نظر سنگین فصیل تعمیر کرنی پڑی، یہ ارک قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ علی عادل شاہ کے ورثا نے محلات میں اضافہ کیا۔ ارک قلعہ یا شاہی فصیل کا قطر ایک میل ہے۔ یہاں جا بجا مضبوط برج بنے ہیں۔ قلعے کی تعمیر کے لیے پتھر کی ضرورت تھی اسی جگہ سے پتھر نکالا گیا اور انھیں گڑھوں کو حصار کی حفاظت کے لیے آگے چل کر خندق بنا لیے گئے۔ ابراہیم عادل شاہ کے زمانے تک شہر کی آبادی کافی بڑھ چکی تھی اور اس کی دفاع کے لیے ایک اور سنگین فصیل تعمیر کی گئی، جس کا قطر سوا چھ میل یا گیارہ کیلومیٹر ہے۔ فصیل کی

دیوار 24 فٹ چوڑی اور 60 فٹ اونچی ہے، اس میں توپیں نصب کرنے کے لیے 120 برج بنے ہیں، بندوقوں کے لیے چھ ہزار سوراخ، اس کے علاوہ 70 چور سوراخ تھے جس میں سے دشمنوں پر گرم تیل انڈیل دیا جاتا تھا۔ قلعے کے بلند و بالا دروازوں کے باہری حصے پر ایک فٹ سے بھی زیادہ لمبے لوہے کی میخ لگائی گئی تھی تاکہ دشمن کے ہاتھی بھی دروازے نہ توڑ سکیں۔ قلعے کے اطراف 40 تا 50 فٹ گہری اور چوڑی خندقیں بنائی گئیں تھیں انھیں پانی سے بھر رکھا تھا اور اس میں آبی درندے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ 1566 میں قلعے کا کام شروع ہوا اور تین سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ ارک قلعے میں آنند محل اور سات منزل یا سات کھن کے محلات ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کی تعمیرات ہیں۔ جس میں ابراہیم عادل شاہ مقیم تھا۔ شہر بیجاپور جو ریاست کا دارالسلطنت تھا اس دور میں ایک عظیم الشان اور متمول شہر تھا۔ شہر بلند و بالا سنگین مکانات سے بھرا تھا، جا بجا ہاتھی نظر آتے تھے اور جوہریوں کی دکانیں سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ بیش قیمت ہیرے جواہرات سے پٹے ہوئے تھے۔ شہر بڑا ہی پر فضا اور اس کی آب و ہوا صحتمند تھی۔ خاص بازار کی سڑکیں کشادہ تھیں اور ان کے کنارے دو رویہ سایہ دار درخت تھے۔ شہر کی دیگر دکانیں نوادرات سے بھری ہوتی تھیں۔ مشروبات، عطریات، فواکہات اور نانبائی کے دکانوں کی کثرت تھی۔ ان کے علاوہ رقص و سرود میں مگن رکھنے والے طائفے اور خوبصورت لڑکیوں اور حسیناؤں کی کمی نہیں تھی جو سج دھج کر بازاروں کی زینت بنا کرتی تھیں۔ یہ ساری باتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں شہر بیجاپور نہ صرف پر امن تھا بلکہ عوام و خواص چین کی بانسری بجاتے۔ اس زمانے میں یہاں تمبا کو استعمال ہوتا تھا۔ یہاں سے یہ تمبا کو شمالی ہندوستان گیا۔ عبدل اس کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے۔

عجب شہر دستا ارابا نگار   زمیں باہیا گل پدک کر سنگار
دسیں برج پچ پچ عجب یوں نمائے   جڑے پاچ الماس کے خرش لائے
وہیں شہر درمیاں کا کوٹ جان   دسے دوسرا دور درمیان بیان
ہوا مدھ سو نایک محل شاہ کا   کنڈل تارے ہو رکھ سو گھر ماہ کا
دسے شہر میں کوٹ بچ شاہ گھر   محل چاند دولت کھلا کوٹ کر
دسے شہر ہر جنس معمور مانہہ   مگر بھشت کا عکس پڑیا چھانہہ
ہوا بخش ہر ٹھاؤں ماڈھیوں اوپر   نہ باقی شہر یوں سو شاہوں کے گھر
گلے باہ کنٹھمال بازار ہار   پدک جوڑ مسجد سو درمیان ٹھار
زماناں عجب یوجنا پونگڑا   بدیا پور نگر روپ ہوکر کھڑیا

آج یہاں صرف کھنڈرات باقی ہیں، کسی زمانے میں بازار کی رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ آج صرف اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس پس منظر میں اس زمانے میں یہاں کیسی رونق ہوا کرتی تھی اور کیسی چہل پہل تھی۔ اسی زمانے میں یوروپی سیاحوں اور شمالی ہند کے مغل سفیر اسد بیگ نے شہر بیجاپور دیکھا تھا، اور ان کی تفصیلات قلمبند کر لی تھیں وہی چیزیں دستاویزات کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مقامی شاعر نے جن تفصیلات کو قلم بند کیا ہے وہ سب سے بنیادی اور اہم بات ہے۔ اس زمانے کے بازاروں میں 'رتنوں کے ڈھگ' (آج بھی دکھنی میں ڈھگار کا لفظ ڈھیر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) یعنی قیمتی پتھروں کے ڈھیر لگے رہتے تھے جیسے یاقوت، فیروز نیلم وغیرہ جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس زمانے میں دولت کی فراوانی تھی۔ یہاں کی خوشبوؤں کی دکانیں کافی مشہور تھیں۔ یہ شہر عالموں، فاضلوں، ہنرمندوں اور طوائفوں سے بھرا تھا، یہ رنگ روپ کا پر امن شہر تھا۔

اسی جنس سب روپ بدیا بھریاں   بدیاپور نگر میں بدیا رسنگ کھڑیاں

……

نہ اس شہر میں نین آنجھو جھڑیں   سو بن میگھ دھاراں نہ ہو کچ پڑیں
نہ اس شہر میں کوئی دردوں ہنکار   سو بن پہنائے شہنائی نا کوئی پکار
نہ پڑتا شہر میں کُو باندھیا نظر   سو بن موتیوں ہور پھولو کی لڑ
نہ اس شہر میں کوئی رگڑے کسے   سو بن زعفراں، مشک نا کچھ دسے
نہ اس شہر میں کوئی مارے کسے   سو بن گھاؤ منڈل نہ دوسرا دسے

نورس پور:

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے شہر کا نام بدل کر ودیا پور رکھا وہیں بیجاپور کے مغرب میں چار میل کے فاصلے پر ایک اور ذیلی شہر نورس پور کی بنیاد 1600-1599 رکھی۔ یہ شہر پانچ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس میں شاہی محلات، ذیلی مکانات اور حصار وغیرہ شہنواز خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ یہاں بادشاہ نے اپنے لیے ایک خوبصورت محل تعمیر کروایا، جس کو سنہری اور ارغوانی رنگوں سے سجایا گیا۔ دربار کے سامنے سے بیجاپور تک ایک چوڑی سڑک بنوائی جس کے دونوں طرف دو منزلہ دکانیں اور بیچ میں مانک چوک تھا اس کے چاروں طرف سے سڑکیں نکال کر دکانیں بنوائی گئیں۔ شہر کا نام نورس پور تھا اور یہاں کا شاہی محل 'نورس محل کہلاتا تھا۔ اس کو سنگیت محل بھی کہا جاتا تھا۔ خود ابراہیم عادل شاہ نے بھی کتاب نورس میں نورس پور کا تذکرہ کیا ہے۔

ابراہیم آکھیں یو کویت نورس' نورس پور گن نگر

ظہوری نے نثر سوم میں اس شہر کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ عبدل نے اپنے انداز سے 'در تعریف

نورس محل حضرت شاہ کے عنوان سے چند شعر کہے ہیں

سنو اب صفت شاہ محل رہن ٹھاؤں   دھریا ناؤں نورس محل تس جو پاؤں
ولے محل نورس دھریا ناؤں یوں   بھریا رنگ نورس نت آٹھ روپ جیوں
ولے محل نورس ہوا یوں اٹھان   دسے گگن آگن ہو اسکا نشان
گگن سات سیڑھی ہو مل جوڑ کر   نہ لگ محل نورس کے ایک کھن اوپر

1650 میں فزونی استرآبادی نے ہندوستان کی سیاحت کی، بیجاپور بھی گیا، اس وقت وہ کھنڈر بن چکا تھا۔ ان کھنڈرات سے متاثر ہو کر اس نے لکھا ہے کہ ان کھنڈروں میں شاہی محل بھی ہے جس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ اس نے ان عمارتوں کا مقابلہ آگرہ، دہلی اور لاہور کی عمارتوں سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نورس پور کے محلات دیگر مذکورہ محلات سے برتر ہیں۔

ابراہیم کالاؤلشکر:

تواریخ ابراہیم کے رزمیہ کارناموں سے پر ہیں۔ دلاور خاں کے بعد قطب شاہوں سے جو زور آزمائی ہوئی وہ بیجاپور کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ دربار کی شان وشوکت، لاؤلشکر (جس میں باون ہزار سوار، ایک لاکھ احشام اور نو سو پچپن فیل بتائی جاتی ہے)۔ عبدل نے بھی اس کے لاؤلشکر کے بارے میں شعر کہے ہیں۔

کھڑے بہت اسپت، گجپت راؤ   کہ نرپت کہتیں نہ کچھ گنت آؤ
کھڑے مست جھولے تو ہستی اپار   گگن شاہ دہلیز تل جیوں پہار

ان ہاتھیوں کی 'کڑگرات' ان کے 'اجل دنت'، ہر قسم و ہر ملک کے گھوڑے، اونٹوں کی قطاریں، سلحداروں کا ہجوم یہ ساری چیزیں ابراہیم عادل شاہ کی شان وشوکت اور عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور کم وبیش یہی تفصیل ظہوری کی سہ نثر میں ملتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ شکار کا شوقین تھا۔ عبدل نے 'در تعریف رفتن شکار' میں اس کی تفصیل دی ہے۔ جب وہ شکار کو نکلتا دمامیوں کی آوازوں سے زمین دہل جاتی، نشان گرج اٹھتے، یوں کہیے کہ ان گرج دار آوازوں سے زمین وآسمان تھرا جاتے۔ دریا اور سمندروں میں تلاطم پیدا ہو جاتا۔ عبدل نے اس ہیبت ناک آوازوں کے نتائج کا بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ زمین ان آوازوں سے جیسے ہی تھرا اٹھتی تو اس کا لہو پانی بن کر چاروں طرف بکھر جاتا، درختوں کی شاخیں بالوں کی طرح بکھر جاتیں اور زمین کے رونگٹے گھاس بن کر اس کے تن پر کھڑے ہو جاتے۔

بکھر بال تن جھاڑ ہر اک دھر
کھڑے رونگٹے گھاس سب آنگ بھر

ادبی اہمیت:

عبدل کا ابراہیم نامہ ادبی اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ اس نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کا بزمیہ مثنوی کی شکل میں قصیدہ لکھا۔ جس میں اپنے ممدوح کے حسن صورت وسیرت، شہر بیجاپور، نورس پور اور ان کی شان وشوکت وعظمت اور اس کی ادب وفن نوازی کی تفصیل ملتی ہے۔ عبدل نے تاریخی حقیقت کو افسانوی طور پر پیش کیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شخصیت، اس کا دربار، اس کے رزم وبزم وغیرہ تاریخی حقائق ہیں، جنھیں عبدل نے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ جہاں تک تخیل کی بات ہے وہ بھی اس مثنوی میں ملتا ہے مثلاً اس مثنوی کے آخری حصے میں 'بسنت راؤ (شاہ بہار) کا تذکرہ ہے وہ خالص تخیل کا حصہ ہے جس میں میزبانی کے جشن میں وہ ساری باتیں جو ابراہیم کے دربار میں دیکھی تھیں شعری جامہ پہنا کر بیان کیا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے جب عبدل سے یہ فرمائش کی کہ وہ اس زبان میں مثنوی لکھے تو اس کے سامنے کئی ایک مسائل کھڑے ہوئے کیونکہ وہ عرب وعجم کی زبان اور اسلوب سے واقف نہیں ہے۔ اس کے سامنے باکمالوں کا کوئی نمونہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنی بات کو اسی طرز میں پیش کر سکے۔ اس کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا تھا، اسی لیے یہ تذبذب نظر آتا ہے کہ وہ کس زبان میں شعر کہے۔

جمالیاتی نقطۂ نظر سے جب اس کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنے بادشاہ جگت گرو کا چیلا نظر آتا ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ عقل اور بچن کے باہمی ربط کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جو اس کے تنقیدی شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عبدل کے خیال میں شعر شعور سے بنتا ہے اور شعور کا ماخذ 'بچن' ہے۔

بچن بیج ہے عقل کی مول کا   بچن باس ہے عقل کے پھول کا

اسی سے تمام فنون کی تخلیق ہوتی ہے، اسی سے ازل اور ابد کی طنابیں ملتی ہیں اور ترلوک جنم لیتے ہیں۔ جوہری کی طرح شاعر شعر کا پارکھ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو بچن کا گیان ضروری ہے۔ بچن اور ارتھ کے تعلق کو اس نے بڑی اچھی تشبیہ سے سمجھایا ہے۔ بچن کو وہ درخت سے اور ارتھ کو پھل سے تشبیہ دیتا ہے۔ لفظ ہمیشہ معنوں سے پر ہونا چاہیے جیسے انار بیجوں سے ہوتا ہے۔

توں کر حرف جھاڑ کو سب باردار
بھرے خوب معنی سو پھل آشکار
توں بھر بیچ معنی سو جیوں بیج انار
حرف بول تھوڑے، آرتھ بے شمار (144-143)

عبدل کے کلام میں فصاحت، بلاغت، نزاکت خیال، سلاست اور روانی کی شدت سے کمی محسوس کی جاتی ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے اسلوب پر ہندی کے گہرے اثرات ہیں۔

مثلاً عبدل سے قبل برہان الدین جانم کی مثنوی ارشاد نامہ صوفیانہ اصطلاحات سے پر ہے تو ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس موسیقی کی اصطلاحات سے پر ہے۔ بعد کے آنے والے شعرا نے اس میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ مثلاً صنعتی بیجاپوری ’قصہ بے نظیر‘ (1055/1650) نے اپنی زبان کو سنسکرت کے اثر سے نکال کر دکھنی کی موڑ دیا۔ جس کے باعث بیجاپور کی زبان اور اسلوب میں بہت بڑی تبدیلی آتی ہے۔ عبدل کا ابراہیم نامہ اسلوب کے اعتبار سے شعر میں اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔ اس کے کلام میں سلاست و روانی، فصاحت وبلاغت کے مقابلے میں خیال آرائی اور تخیل ہے۔ آمد کے بجائے آورد ہے مثنوی کی شکل میں قصیدہ ہے، لیکن ان کی خصوصیات سے بالکل معرّیٰ۔ صنعت گری میں زور، تشبیہ، استعارہ اور تمثیل سے پرُ۔ اس کی مثال میں ہم بسنت راؤ کو متشکل دیکھ سکتے ہیں جو خالص تمثیلی پیرایے میں پایا جاتا ہے۔ عبدل کے ہاں رقاصاؤں کے حسن و شباب میں لذتیت پائی جاتی ہے جو بادشاہ کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ عبدل کے اسلوب شعری میں سب سے بڑی کشش اس کی قوت بیان، نادر تشبیہات، ہندو دیومالا کی تلمیحات ہیں مثلاً نورس محل کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

کہ یارات، دن کے دو مزدور دھر   نورس محل کا کام بنیاد کر
لیا گگن کا ٹوکرا دیس سر   سورج اینٹ مانک سو دھر چرخ بھر
نت اٹھ دو ہوے سو (دو) دریا منجھار   چووے نیر پرگٹ ہو کرنا کی دھار
یہین رات بھی سیس آپن دھرے   گلاوا موتیوں چاند چونا کرے
کلا ٹوکرا بھی جو سٹ لیائے کر   پڑیاں اچھل چھیٹا ہو تارے بکھر

اور یہی تمثیلی انداز ’درتعریف مجلس حضرت شاہ عالم پناہ‘ و ’درتعریف کہ شب گذشتہ و روز خود آراستہ کردہ بہ مجلس شاہ آمد‘ میں ملتا ہے آمد صبح کو استعارہ اور کنایہ کی زبان میں یوں لکھتا ہے۔

اڑی رات کو بل گگن بن اوپر
نکل دیس کا باز سچ صبح پر
پکڑ سُرج چنگل سوں نکھ کرن رات
دسیا لال لوہو شفق گگن دھات (409-410)

مجموعی طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عبدل اپنے اسلوب کا بانی ہے۔ اس نے جس صناعی کا مظاہرہ کیا ہے قدیم ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مثنوی کی بحر فعولن فعولن فعولن فعول کے استعمال کے باوجود سلاست اور روانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مبالغہ اور غلو کا کثرت استعمال وغیرہ عیوب اس لیے دکھائی دے رہے ہیں کہ عبدل کو ایک نئی زبان میں لکھنا پڑا جو ادبی اعتبار سے اپنے فن میں پختگی نہیں پیدا کر سکی تھی اور عبدل ہے کہ اس میں شاہ نامہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم عبدل کی حیثیت صرف تاریخی نہیں بلکہ وہ ایک ابتدائی اہم شعری کارنامہ ہے، جو اپجی بھی ہے، کسی کا ترجمہ یا کسی کا رہین منت نہیں۔ اور یہ بیانیہ اور تمثیلی شاعری کے اسلوب کا ماخذ بھی ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نصرتی جیسے شاعر نے اپنے شاہ نامہ (علی نامہ) کی بنیاد اسی پر رکھی ہوگی اگرچہ اس سے قبل عبدل نے اس کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔ لیکن نصرتی اپنے کلام میں کسی پیش رو کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال کا دم بھرتا ہے۔

کرناٹک اردو اکادمی کا یہ مستحسن اقدام ہے کہ اس شاہکار فن پارے کے دوسرے ایڈیشن کو بڑی آب وتاب اور خوبصورتی سے 1999 میں شائع کیا۔ اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس میں تاریخی تصاویر کو دیکھتے ہیں۔ سنہ 2013 میں بیجاپور کے ایک سرکاری ادارہ عادل انواد نے بیجاپور کے تاریخی ماخذ کو کھنگال کر اس کا ترجمہ علاقائی زبان کنڑا میں کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس پراجکٹ میں فارسی اور دکھنی کے مخطوطات ومطبوعات کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ ابراہیم نامہ بھی اس میں شامل ہے۔ کنڑا زبان میں اس کے ترجمے سے کنڑ یگاؤں تک یہ بات محدود رہ جاتی، اسی لیے اس کو اب اردو اور انگریزی زبان میں بھی شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ تاکہ عادل شاہی دور کی مکمل تاریخ ساری دنیا کے سامنے آسکے۔

❖

Dr. Mohamad Sibghatullah
Retd. Principal
No. 50-12, Aashiyana
4th Main Vasanthappa Block
Ganga Nagar, Bengaluru-560032
Mob: 09448353825